نظام خلافت وامارت
کی
شرعی حیثیت

مولانا عبدالعلیم اصلاحی

نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی۔

نظامِ خلافت وامارت

کی

شرعی حیثیت

مولانا عبدالعلیم اصلاحی

نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی۔٦

نام کتاب	:	نظامِ خلافت وامارت کی شرعی حیثیت
مصنف	:	مولانا عبدالعلیم اصلاحی
صفحات	:	32
ناشر	:	نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی دہلی
مطبع	:	بھارت آفسیٹ پریس، دہلی۔٦
اشاعت	:	2009
قیمت	:	Rs 18/-

ناشر

نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی

۲۰۳۵، قاسم جان اسٹریٹ

بلیماران، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

تمہید

نظام خلافت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس موضوع پر گفتگو کیلئے بطور تمہید موجودہ عالم اسلام کے ایک مستند عالم باعمل کے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔

''اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں ہے چند مختلف لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد ورسوم کا نام نہیں وہ زندگی کا نظام ہے وہ زمانہ کی فضأ طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے۔ اور عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق ومعاشرت، زندگی کے مقصد ومعیار، زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ اس کو مادی وسیاسی اقتدار حاصل ہو۔ صرف اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق حاصل ہو۔ اسی کے صحیح نمائندے دنیا کیلئے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق واعمال کی اشاعت ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:۔ **الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللّٰہ عاقبۃ الامور (۲۲:۴۱)**

ترجمہ:۔ یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کردیا ''یعنی ان کا حکم چلنے لگا تو'' وہ نماز قائم کریں گے ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے۔ برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہوسکتا۔ اسلام کے نظام عمل کا ایک مستقل حصہ ایسا ہے جو حکومت پر موقوف ہے۔ حکومت کے بغیر قرآن

مجید کا ایک پورا حصّہ نا قابل عمل رہ جاتا ہے۔خود اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن نہیں، مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی و دیوانی فوجداری معطل ہو جاتا ہے اسی لیے قرآن غلبہ و عزت کے حصول پر زور دیتا ہے اور اسی لیے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی۔اور اس کو اکابر صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین پر مقدم رکھا۔جسے بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کیلئے حضرت حسینؓ نے اپنی قربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور نااہل ہاتھوں میں نہ جانے پائے۔"(سیرت احمد شہید حصّہ اول صفحہ۔۵۱۵)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

"اسلام کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں۔ان میں عبد و معبود کے تعلق کی اصلاح و تنظیم پھر اس کی ترویج و توسیع، انسانی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالنے کی سعی، افراد جماعت کے باہمی تعلقات کی استواری اور خوشگواری بھی ہے۔ایک ایسی شائستہ، خوش اسلوب، پرسکون اور پرامن زندگی کیلئے فضا ہموار کرنا بھی ہے جس میں خالق کے فرائض مخلوق کے حقوق دونوں کے ادا کرنے کا پورا موقع اور ان کمالات اور ارتقائی منازل تک پہنچنے کا پورا امکان پایا جائے۔ جس کی صلاحیت انسان کی فطرت میں دیعت کی گئی ہے۔اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی قوت عمل اور ذہانت ان خطرات کا مقابلہ کرنے، ان نقصانات سے بچنے اور ان مفاسد کے دور کرنے میں ضائع نہ ہو جو کبھی غیر منظّم زندگی سے پیدا ہوتے ہیں کبھی خود ساختہ قوانین کبھی مطلق العنانی اور جاہ و اقتدار کی ہوس سے۔اس کے لیے ایک منزل من اللہ قانون آسمانی شریعت اور خدا کی الوہیت و حاکمیت کے عقیدہ پر ایک نظام خلافت و امارت ضروری ہے۔(تاریخ دعوت و عزیمت حصّہ پنجم ۲۵۹ مولانا سید ابوالحسن علی)

تین مسلمات

(ا) اسلام ایک کامل اور ہمہ گیر دین ہے:۔

یہ سمجھنا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرے سے باہر ہے یا کسی شعبہ زندگی میں اس کی تعلیم ناقص ہے۔نصوص شرعیہ سے انکار کے مترادف ہے۔ **اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً.**

آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا۔

اس کا مطالبہ پورے دین کو اختیار کرنا ہے۔اونے پونے کی سودا بازی نا قابل قبول اور باعث ہلاکت ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ یَفْعَلُ ذَالِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ٥

تو کیا تم کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو پس یہ تم میں سے جو بھی کریں گے ان کا بدلہ دنیا میں صرف رسوائی ہے اور روز قیامت شدید ترین عذاب میں ڈھکیلے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

قرآن اور سنت اور ان کی بنیاد پر علماے اسلام نے فقہ کے نام سے جو ایک جامع قانون مرتب کر دیا ہے۔اس کا آپ مطالعہ کریں، اور دیکھیں انسانی زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس کے متعلق اصولِ قانون اور قانونی نظائر موجود نہیں ہیں۔

علامہ ابن نجیم نے امور دین کو جن مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے ان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہر دور میں اسلام کو کامل نظام زندگی سمجھا یا گیا ہے۔

جان لو امور دین اعتقادات، عبادات معاملات حدود و تعزیرات اور آداب سے متعلق ہیں۔ اعتقادات کی پانچ قسمیں ہیں (۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالالملائکہ (۳) ایمان بالرسول (۴) ایمان بالکتب (۵) ایمان بالیوم آخر۔ عبادات بھی پانچ ہی:(۱) نماز (۲) زکوٰۃ (۳) روزہ (۴) حج (۵) جہاد۔ معاملات بھی پانچ ہیں:(۱) مالی معاوضات (۲) مناکحات (۳) مخاصمات (۴) امانات (۵) ترکہ و میراث۔ حدود و تعزیرات بھی اصلاً پانچ چیزوں سے متعلق ہیں: قتل نفس، سلب مال، ہتک ستر، ہتک عزت، قطع نسل۔ آداب چار ہیں: اخلاق، شمائل حسنہ، سیاسیات، معاشرتی مسائل۔

"البحرالرّائق کتاب الطھارۃ"

صاحب ہدایہ کتاب البیوع میں لکھتے ہیں: لان البیع انشاء تصرف والانشاء یعرف بالشرع یعنی بیع ایک تصرف کا پیدا کرنا ہے اور تصرف کا پیدا کرنا شریعت سے معلوم کیا جاتا ہے اس فقرہ میں دراصل ایک اصول بتایا گیا ہے کہ اللہ کی اس زمین پر تصرف کیلئے شریعت کی اجازت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ فقہا نے احکام کی ایسی تقسیم کی ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے اور کوئی حرکت کوئی فعل کوئی حادثہ اور واقعہ اس سے باہر نہیں ہوسکتا۔

ان کے نزدیک احکام کی دو قسمیں ہیں۔ عزیمت اور رخصت، عزیمت اصل ہے اور وقتی عوارض کی بنا پر جو حکم لگایا جاتا ہے اسے رخصت کہتے ہیں۔ عزیمت کے اقسام فرض، واجب، سنت، نفل، حرام، مکروہ اور مباح ہیں۔ آج تک مسائل اور معاملات کی کوئی ایسی قسم نہیں معلوم ہوسکی اور نہ قیامت تک وقوع پذیر ہوسکتی ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ شرعی احکام کے تحت نہیں آتی۔

اوپر ہم نے فقہی تصریحات نقل کی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے جو لوگ زندگی کے

بہت سارے شعبوں کو دین سے خارج بتاتے ہیں اور کہتے ہیں فلاں معاشی مسئلہ ہے۔ یہ حکومت کی باتیں ہیں۔ یہ دنیاوی معاملہ ہے دین کو ان سے کیا بحث۔ ایسے لوگ درحقیقت یا تو مرعوبیت اور ہوس پرستی کے شکار ہیں یا پھر دینی شعور سے نابلد۔

(۲) اللہ تعالیٰ حاکم علی الاطلاق ہے:

شریعت اسلامی جب ہر شعبہ زندگی کے لیے اپنا ایک مخصوص حکم اور قانون رکھتی ہے اور ناقص نہیں ہے تو لازماً وہ ہرگز اس بات کی روادار نہیں ہوسکتی کہ کوئی اس کے حدود سے ذرّہ برابر تجاوز کرے اور غیر خدا کی حاکمیت تسلیم کرے خواہ وہ انسان کا اپنا نفس ہو یا کوئی غیر الٰہی حکومت یا کسی ملک کے جمہور اور عوام۔ قانون کی ہمہ گیری سے قانون ساز کی ہمہ گیری از خود ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک حاکم اعلیٰ صرف ایک ہے۔ اِنِ الحُکمُ اِلاَّ لِلّٰہ ''حکم صرف اللہ کیلئے ہے''۔

فَالحُکمُ لِلّٰہِ العَلِیِّ الکَبِیرِ ''حکم اللہ ہی کیلئے ہے جو بالا دست اور بڑا ہے''

لاَ طاعة لِمَخلُوقٍ فِی مَعصِیَةِ الخَالِقِ ''خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے''

فقہ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے: وَالَّذِیْ یعلم من التوضیح فی ضبطها ان الحکم مفتقر فی الحاکم والمحکوم علیه والمحکوم به فالحاکم هو اللّٰه تعالیٰ والمحکوم علیه هو المکلف والمحکوم به فعل المکلف (نور الانوار ٢٦٦)

قواعد کے ضبط میں توضیح سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ کہ حکم محتاج ہے حاکم، محکوم علیہ اور محکوم بہ کا پس حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور محکوم علیہ مکاف اور محکوم بہ مکاف کا فعل ہے۔

توضیح میں مزید وضاحت:

لقسم الثانی من الکتاب فی الحکم ویفتقر الی الحاکم وهو اللّٰه تعالیٰ لا العقل علی ما مر فی باب الامر (٢٠٧)

کتاب میں سے قسم ثانی حکم کے بارے میں ہے اور حکم محتاج ہے حاکم کا اور وہ اللہ تعالےٰ

ہے نہ کہ عقل جیسا کہ باب الامر میں گزر چکا. **لا حکم الا من اللّٰہ تعالیٰ باجماع الائمة لا کما فی کتب بعض المشائخ ان ھذا عندنا وعندالمعتزلہ الحاکم العقل فان ھذا مما لا یجتریٔ علیہ احد من یدعی الاسلام (شرح مسنم الثبوت ۱۳)**

حکم صرف اللہ کا ہے اس پر ائمہ کا اجماع ہے نہ کہ جیسا مشائخ کی کتابوں میں ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک حاکم عقل ہے کیونکہ یہ ایسی بات ہے جس کی جرأت کوئی مدعی اسلام نہیں کرسکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی شخص کوئی خاندان کوئی گروہ اور کوئی قوم حکم کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ اسی طرح مجرد عقل اور تجربہ کی بنیاد پر بھی کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اور خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا یہ کہہ کر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت ساری چیزیں عقل و تجربہ سے بھی ثابت ہوتی ہیں اسی لئے فقہ کو اس کی ضرورت پڑی کی صریح لفظوں میں عقل کی حاکمیت کا انکار کردیا جائے لیکن قابل رائج بات یہ ہے کہ اس وضاحت کی ضرورت پہلے غیر مسلم فلسفیوں کے مقابل میں پڑی تھی اور آج علمبرداران اسلام کے مقابل میں ہے۔

(۳) اصولِ شریعت:۔

حاکم اعلیٰ اللہ کے تفصیلی احکام اور قوانین معلوم کرنے کیلئے صرف چار ذرائع ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس کتاب تو اس لیے کہ وہ صریح طور پر حاکم اعلیٰ کا کلام ہے اور سنت اس لیے کہ رسول یعنی اس کے نمائندہ کی قولی اور عملی تعلیم کا نام سنت ہے اور اجماع اس لیے کہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ ہے، رہا قیاس اور اس کی دوسری شاخیں استحسان، استصحاب وغیرہ تو ان کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے بلکہ کچھ خاص شرائط اور قیود کے ساتھ کتاب وسنت کے مخفی احکام معلوم کرنے کے ذریعے بنتے ہیں بجائے خود ان سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔

ان چار ذرائع سے جو بھی حکم معلوم ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا اور ان طریقوں کو

چھوڑ کر جو قانون اور ضابطہ بھی بنایا جائے وہ اللہ کی تشریعی حاکمیت سے انکار کی دلیل ہے۔ خواہ وہ قانون اور ضابطہ کوئی ایک فرد بنائے یا کوئی قوم یا کسی ملک کے جمہور۔

دین کی ہمہ گیری کا تقاضا:۔

مذکورہ تینوں مسلمات (۱) اسلام کا ہمہ گیر ہونا (۲) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور (۳) شریعت کے اصول اربعہ کو تسلیم کرنے کا تقاضا ہے کہ انسان سراپا دین میں گم ہو جائے اور تمام مسائل زندگی کی اساس دین قرار پائے۔ انسان مدنی الطبع ہے اس کو ہر دور میں اجتماعی نظم کی ضرورت رہی ہے جو سب کو کنٹرول کر سکے۔ انتشار اور انارکی اجتماعیت کی ضد ہے اس انتشار اور انارکی کو دور کرنے اور اجتماعی نظم قائم کرنے ہی کا نام نظام خلافت اور ہماری زبان میں حکومت ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کیوں دین کی بنیاد پر نہ ہو؟ کس دلیل کی بناء پر انسانی زندگی کے اس اہم شعبہ کو خدائی حاکمیت سے آزاد کیا جائے؟ کیا حکومتی عمل خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے علاوہ کسی دوسری دنیا میں ہوتا ہے؟ یہ زمین اس کی، آسمان اس کا ساری مخلوق اس کی تو پھر کس بنیاد پر اس کے حکم کے بغیر تصرف کرنا روا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی کوئی سند پیش کی جا سکتی ہے؟ کہ اس نے اپنے اقتدار اور اختیار کو محدود کر دیا ہے خدا کے پیغمبروں نے اس کی حاکمیت کے لیے کوئی لائن کھینچ دی ہے کہ یہ خدائی حکومت کی سرحد ہے اور یہ قیصر کی۔

عقل کا تقاضا شرعی مسلمات، اسوۂ انبیاء اور خلفائے راشدین کی اتباع کا مطالبہ ہے کہ حکومتی عمل بھی اسلام کے زیر سایہ ہو اور خدائی ہدایت کے تحت ہو نہ کہ اس سے آزاد۔ ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے۔ شریعت کے کچھ احکام ہر ہر فرد سے متعلق ہیں اور ایک معتد بہ تعداد ایسے احکام کی ہے جن کی مخاطب پوری امت ہے۔ مثلاً قرآن میں صریح طور سے چور کے بارے میں حکم ہے۔ اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹو۔ یہ ایک کھلا ہوا حکم ہے۔ جس کا مخاطب کسی فرد یا طبقہ کو نہیں بتایا گیا بلکہ تمام

مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے لیکن اس حکم کی تعمیل ہر ہر شخص الگ الگ نہیں کرسکتا اور نہ بیک وقت پوری امت کے ہاتھوں اس کی تعمیل ہوسکتی ہے۔ پھر تعمیل کیسے ہو اس کا صرف ایک جواب ہے وہ یہ کہ پوری امت جسد واحد بن جائے اس کا ایک قائد اور سر براہ ہو اس کا اپنا ایک اجتماعی نظم ہو جس کے ذریعے اجتماعی احکام کی تنفیذ عمل میں آئے امت میں انتشار اور انار کی ہو تو شریعت کے بہت سارے احکام کی تعمیل نہیں ہوسکتی اسی بناء پر اسلام میں اجتماعیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً وَلاَ تَفَرَّقُوْا

(اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ میں نہ پڑو)۔

حضورؐ نے فرمایا: من شذّ عن الجماعة شذّ فی النّار جو جماعت سے الگ ہو وہ آگ میں گیا۔ عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ القاصية (تم پر جماعت لازم ہے اس لئے کہ بھیڑیا انہی بکریوں کو کھاتا ہے جو گلہ سے بچھڑ جاتی ہیں)۔

عہدِ رسالت میں بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات خود اللہ کی جانب سے پوری امت کی راہبر اور زمہ دار تھی اور وہ سب احکام جو اجتماعیت سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے ہاتھوں انجام پاتے اور آپ کے وصال کے بعد صحابہ اکرام نے ایک خلیفہ کے انتخاب کے ذریعہ اس ذمہ داری کو کما حقہ، ادا کیا اور رسول خدا کی امت انتشار کی شکار نہیں ہوئی۔

اجتماعیت کے اسی نظام کو اسلام کی اصطلاع میں خلافت وامارت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی خلافت کو ہم اسلامی حکومت یا حکومت الٰہیہ کہتے ہیں یہ حکومت مختلف ناموں سے ہر دور میں مسلمانوں کا مطمح نظر اور اس کے نزدیک حکومت کا سب سے اعلیٰ معیار رہی ہے۔ اور اس کو یہ یقین رہا ہے کہ اس کا قیام ایک فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا سے شر وفساد مٹا کر امن قائم کرنے کی واحد تدبیر ہے۔

اسلامی خلافت :۔

اوپر کی گفتگو سے اسلامی حکومت اور خلافت کی تعریف خود متعین ہو جاتی ہے لیکن مزید توضیح کیلئے میں یہاں ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعریفیں نقل کرتا ہوں۔ ابن خلدون نے خلافت کی جو تعریف کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے: خلافت کے لغوی معنیٰ جانشینی اور اس کا اصطلاحی مفہوم آنحضرتؐ کے جانشین کی حیثیت سے مطلق دین اور دنیاوی امور میں فرمانروائی کا حق تھا خلیفہ کی شخصیت شرعی نقطہ نظر سے دینی و دنیاوی معاملات میں فرمانروائی کی حامل تھی۔ یہ فرماں روائی شریعت کے دستور اور قوانین کی پابند تھی خلافت کا حقیقی مقصد ناموس اسلام کا تحفظ اور شرعی زاویہ نگاہ سے حکومت کے نظم ونسق کی تنظیم اور اسکا قیام تھا۔ (مقدمہ (ص ١٦٦)

شاہ ولی اللہ صاحب نے خلافت کی تعریف یوں کی ہے۔

"هی الریاسة العامة فی التصدّی لا قامة الدین باحیاء العلوم الدینیه واقامة ارکان الاسلام والقیام بالجهاد وما یتعلق به من ترتیب الجیوش القرض للمقاتلة واعطاءهم من الفئی والقیام بالقضاء واقامة الحدود ورفع المظالم والامر بالمعروف والنهی عن المنکر نیابة عن النبی صلی الله علیه وسلم (ازالة الخفا)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں علوم دینیہ کے زندہ کرنے اور ارکان اسلام کو قائم کرنے اور جہاد اور متعلقات جہاد جیسے لشکروں کو تربیت دینے مجاہدین کو وظائف دینے مال غنیمت کو تقسیم کرنے اور عہدۂ قضاء کے فرائض انجام دینے اور حدود کو قائم کرنے اور مظالم کو رفع کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ اقامت دین کا اہتمام کرنے والی ریاست عامہ کو خلافت کہتے ہیں"۔

یہ دو اقتباس اسلامی حکومت کی تعریف متعین کرنے کیلئے بالکل کافی ہیں۔ اسلامی حکومت کے مقاصد اور دائرہ کار کو غیر مبہم الفاظ میں یہاں واضح کر دیا گیا ہے۔ اب جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں حکومت کا کوئی خاص تصور اور خاکہ نہیں ہے۔ تو ان سے پوچھا

جائے کے اگر یہ خاص تصور نہیں تو کیا ہے؟ کسی ہیت کا متعین نہ ہونا اور بات ہے اور مقاصد، دائرہ کار، آئیڈیالوجی کا متعین نہ ہونا دوسری بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت علمی اور نظری، عملی اور واقعاتی ہر لحاظ سے ایک جانی پہچانی چیز ہے۔ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ خلفائے راشدین نے جس نوعیت کی حکومت بنائی وہ حکومت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اور اس کا نام اسلامی حکومت ہے۔ لیکن حقائق کو جھٹلانے پر اگر کوئی تل جائے تو اس کا علاج ہی کیا ہے؟۔

اقامتِ خلافت کی دینی حیثیت: اسلامی حکومت کی تعریف متعین ہو جانے کے فوراً بعد یہ سوال آتا ہے کہ اس کو برپا کرنے کی دینی حیثیت کیا ہے؟۔ فرض ہے، نفل ہے مباح ہے۔ آخر کیا ہے؟

شریعت اسلامی کا یہ ایک کلیہ اور طے شدہ اصول ہے کہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی جن چیزوں پر موقوف ہوتی ہے وہ بھی فرض اور واجب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وضو کی فرضیت کے ساتھ ساتھ پانی کے حصول کی کوشش بھی بقدر استطاعت فرض ہے اگر کوئی شخص وضو نہ کرنے کی وجہ بتائے کہ میں مسجد میں گیا لیکن وہاں پانی موجود نہ تھا تو اس کا یہ عذر کسی بھی طرح وضو کی فرضیت کو ساقط نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس پر کنویں سے پانی نکالنا یا کسی سے طلب کرنا ویسے ہی فرض ہے جیسے وضو فرض ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ پانی کے حصول کے لئے جو ذرائع اور وسائل اکٹھا کرنے ضروری ہیں ان سب کا مہیا کرنا بھی حسب استطاعت فرض ہے۔ اسی بناء پر کسی مسافر کیلئے بھی طلب اور جستجو سے پہلے جائز نہیں کہ وضو کے بجائے تیمّم کر لے بشرطیکہ آس پاس پانی ملنے کی توقع ہو یا اس کے کسی ساتھی کے پاس موجود ہو۔

الاترىٰ ان تحصيل اسباب الواجب واجبٌ و تحصيل اسباب الحرام حرام بالاجماع (مسلم الثبوت ۳۸) کیا تم نہیں جانتے کہ واجب کے ذرائع کا حاصل کرنا

واجب اور حرام کے ذرائع کا حاصل کرنا حرام ہے بالا جماع۔

''جس واجب کے اسباب اور شروط کی تحصیل واجب ہوتی ہے اس میں علمائے اصول فقہ نے دو قیدیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ واجب مطلق ہو۔ شارع کی طرف سے کسی سبب یا شرط کیساتھ مقید نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ سبب شرطِ مکلّف کے مقدور میں ہوان دو قیدوں میں سے کوئی ایک قید بھی اگر غائب ہو جائے، تو پھر سبب وشرط کی تحصیل واجب نہ ہوگی۔ پہلی قید کی شرعی مثال وجوب زکواۃ کا مسئلہ ہے۔ چاندی سونے میں وجوب زکوٰۃ کا سبب ایک مکمل نصاب کی ملکیت ہے اور شرط حولان حول ہے لیکن کسی مسلمان پر نہ اس سبب کی تحصیل واجب ہے اور نہ اس شرط کی۔ یعنی کسی مسلمان پر نہ تو یہ واجب ہے کہ وہ جدوجہد کر کے صاحب نصاب بنے اور نہ کسی صاحب پر یہ واجب ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے وہ سال بھر تک بہر حال نصاب کو محفوظ رکھے اس کی وجہ یہ ہے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مطلق نہیں ہے۔ بلکہ شریعت کی طرف سے ایک مقید حکم ہے۔ شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان صاحب نصاب ہو اور سال بھر تک اس کے پاس نصاب محفوظ رہے تو اس پر اس نصاب کی زکوٰۃ واجب ہے۔ اس طرح کے مقید حکم وطلب میں کسی شخص پر شریعت کی طرف سے سبب وشرط کی تحصیل کا فریضہ عائد نہیں ہوتا بلکہ جب سبب اور شرط پائے جائیں تو اس حکم پر عمل واجب ہوتا ہے دوسری قید کی مثال نماز کے اوقات ہیں جن کو اسباب کی حیثیت حاصل ہے لیکن ان اسباب کی تحصیل کسی پر واجب نہیں، اس لیے کہ وہ انسان کے بس سے باہر ہیں۔ ایسا واجب جو شریعت کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو بلکہ مطلق ہے۔ لیکن اس کا وجود یا صحت ادا کسی سبب یا کسی شرط پر موقوف ہو تو ایسے سبب یا شرط کی تحصیل واجب ہے۔ مثلاً شارع کسی مسلمان کو مکلّف کرے کہ اپنا غلام آزاد کر تو اس واجب کا وجود یعنی اس غلام کی آزادی ایک سبب پر موقوف ہے اور وہ ہے لفظ اَعۡتَقۡتُ کا نطق، یعنی جب تک کوئی شخص یہ نہ کہے کہ ''میں نے اس غلام کو آزاد

کیا'' اس وقت تک غلام آزاد نہیں ہوسکتا لہٰذا اس سبب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی یا شارع نے کسی کو مکلّف گردانا کہ ''علم حاصل کر'' ظاہر ہیکہ اس واجب کا حصول چند اسباب پر موقوف ہے تو ان اسباب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی اس لئے کہ ان اسباب کی تحصیل کے بغیر عام حالات میں علم حاصل نہیں ہوتا۔

صحتِ ادا کی مثال نماز میں وضو کی شرط ہے۔ اچھی طرح ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ وضو وجوب صلوٰۃ کی شرط نہیں ہے بلکہ صحت ادا کی ہے۔ یعنی بات یہ نہیں کہ جب تمہیں، وضو ہو تو تم پر نماز واجب ہے بلکہ یہ ہے کہ نماز جو تم پر واجب ہے وہ وضو کے بغیر ادا نہیں ہوتی لہٰذا جس شخص پر نماز واجب ہو اس پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے وجوب زکوٰۃ کی شرط اور صحتِ ادائے صلوٰۃ کی شرط میں بنیادی فرق ہے۔ جس کو سمجھ لینا چاہیے اسباب و شروط کی تحصیل کے وجوب و عدم وجوب کی تفصیل نہ جاننے کی وجہ سے بعض ذہین لوگوں کو بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔ اب ان تفصیلات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹ دینے اور زانی کو کوڑے مارنے کی جو مطلق تکلیف مسلمانوں کو دی گئی ہے اس کا وجود یا صحتِ ادا حکومت کی شرط پر موقوف ہے یا نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو اس شرط کی تحصیل بھی یقیناً واجب ہوگی۔ بالفرض کوئی شخص دعویٰ کرتا ہے کہ قطع ید وغیرہ کا وجوب مطلق نہیں ہے۔ بلکہ مقید ہے تو اسے اس کا ثبوت دینا چاہیے۔

علمائے حق اس پر متفق ہیں کہ نصب امام یا اسلامی حکومت کا قیام ان احکام کی ادائیگی کے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ان احکام کے وجوب میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اگر خلیفہ موجود ہو اور حکومت قائم ہو تو ان پر عمل کرو بلکہ بات یہ ہے کہ یہ احکام جو تم پر واجب ہیں وہ نصب خلیفہ اور حکومت کے بغیر ادا نہیں ہوسکتے لہٰذا ان احکام پر عمل کرنے کے لیے تم پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے۔ (ماخوذ)

اس اصول کو جان لینے کے بعد آپ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی میں مندرج احکام

پر ایک نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کتنے فرائض اور واجبات کی ادائیگی کا دارومدار اسلامی حکومت کا قیام قرار پاتا ہے بطور مثال چند احکام ملاحظہ ہوں۔

جہاد، قطع ید، قذف، حدزنا، حدخمر، اور معاملات میں اللہ کی نازل کردہ ہدایات کے مطابق فیصلہ کرنا یہ قرآن کے قطعی احکام ہیں جن سے انکارنہیں کیا جاسکتا لیکن ان پر آج عمل نہیں ہورہا ہے۔ ہر مسلمان قرآن میں پڑھتا ہے۔ مدرسوں میں ان پر بحثیں ہوتی ہیں تکرار ہوتی ہے مقررین اور مصنفین ان کی باریکیاں بیان کرتے ہیں، ان کے فوائد اوران کے اندر پوشیدہ حکمتوں پر سننے والے سر دھنتے ہیں مگر جب عمل کا سوال آتا ہے تو جواب نفی میں آتا ہے اور بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لیے حکومت ضروری ہے اور آج حکومت اسلامی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب یہ احکام اسلامی حکومت پر موقوف ہیں تو پھر شرطِ موقوف علیہ کی تحصیل ہم پر واجب ہے۔ اوپر کی مثالوں میں سے ایک کی ذرا تفصیل ہم پیش کرتے ہیں تا کہ ہمارا مقصود اچھی طرح واضح ہوسکے ہدایہ کے محشی لکھتے ہیں:۔ **واما وصف القضاء ففرض كفاية فلو امتنع الكل اثموا وقد امر الله تعالىٰ نبيه صلى الله عليه وسلم بقول ”وان احكم بينهم بما انزل الله اليكِ“ وبعث صلى الله عليه وسلم علياً قاضياً الىٰ ليمن ومعاذا وعليه اجماع المسلمين** رہا قضا کا حکم تو وہ فرض کفایہ ہے اگر سب لوگ رک جائیں تو سب گنہگار ہوں گے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ لوگوں کے درمیان اللہ کی نازل کی ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت معاذ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ کتاب المبسوط میں کتاب القاضی کی ابتدا ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

اعلم بان القضاء بالحق من اقوى الفرائض بعد الايمان بالله تعالىٰ وهو من اشرف العبادات لاجله اثبت الله تعالىٰ لأدم عليه السلام اسم الخلافة فقال جل جلاله انى جاعلٌ فى الارض خليفة ط واثبت ذالك لداؤد عليه السلام فقال

عز وجل "یا داؤد انا جعلنک خلیفة فی الارض" وبہ امر کل نبی مرسل حتیٰ خاتم الانبیاء علیہم الصلوٰة والسلام. قال اللّٰہ تعالیٰ انا انزلنا التوراة فیھا ھدی ونوریحکم بہ النبیون وقال تعالی ان احکم بینھم بما انزل اللّٰہ الیک ولا تتبع اھواھم. (۵۹)

ترجمہ: جان لوحق کے ساتھ فیصلہ کرنا ایمان باللہ کے بعد قوی ترین فرائض اور افضل ترین عبادت میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے لئے خلیفہ کا نام تجویز فرمایا اور ارشاد ہوا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اسی چیز کو داؤد علیہ السلام کیلئے قائم رکھا اور فرمایا اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور اسی بات کا ہر نبی حتیٰ کے خاتم الانبیا کو بھی حکم دیا اور ارشاد ہوا ہم نے تورات اتاری اس میں ہدایت اور نور ہے جس کے مطابق انبیاء فیصلہ کرتے ہیں نیز ارشاد ہے اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اس کے بعد صاحب مبسوط نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے نام حضرت عمرؓ کے ایک خط سے یہ فقرہ نقل کیا ہے: **اما بعد فان القضاء فریضة محکمة وسنة متبعة** یعنی قضا ایک محکم فریضہ ہے اور قابل اتباع سنت ہے اور سنت کی تشریح اس طرح کی ہے۔ **(سنة متبعه ای طریقة مسلوکة فی الدین یجب اتباعھا علیٰ کل حال)** یعنی سنت دین میں ایک ایسا لائق پیروی طریق ہے جس کی اتباع ہر حال میں واجب ہے۔ یہ ہے وہ فریضہ جو تمام انبیاء علیہ السلام پر عائد کیا گیا اور آخر میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم دیا گیا اور بڑی شد و مد کے ساتھ جس کا اندازہ ان آیات سے ہوتا ہے۔

مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَا اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ٥

جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وظالم ہے۔

مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَا اُنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡفَاسِقُوۡنَ ٥

جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ فاسق ہے۔

مَنْ لَمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰئِکَ ھُمُ الْکَافِرُوْنَ ہ
جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ کافر ہے''

مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ فرمایئے اور بتایئے اس فریضہ کی ادائیگی کی کیا صورت ہو سکتی ہے ہاں یہ واضح رہے کہ غیر اسلامی حکومتوں میں جو جج اور عدالتیں ہوتی ہیں ان کے ذریعہ یہ فرض ہرگز ادا نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ قاضی کیلئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ صرف نکاح، طلاق اور میراث کے ہی معاملات میں شرعی قاضی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بلا استثنیٰ سارے معاملات زندگی میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ لینے کے علاوہ ایک مومن کیلئے کوئی دوسری راہ نہیں ہے اب سوال یہ ہے کہ ان شرائط و قیود کے ساتھ مقید عدالتیں دنیا کی کس حکومت نے مسلمانوں کو مہیا کر کے دی ہیں یا دے سکتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس فرض کفایہ کی ادائیگی اور دیگر بے شمار فرائض سے سبک دوشی اسلامی حکومت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک با اختیار امام اور خلیفہ کا مقرر کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ عقائد کی مشہور کتاب شرح عقائد نسفی میں صاحب کتاب لکھتے ہیں۔:

ثم الاجماع علٰی ان نصب الامام واجب والمذهب انه یجب علی الخلق سمالقوله صلعم من مات ولم یعرف امام زمانه فقد مات میتة جاهلیة ولان الامة قد جعلوا اهم المهمات بعد وفات النبیّ صلی اللّٰه علیه وسلم نصب الامام حتی قدموه علی الدفن وکذا بعد موت کل امام ولان کثیرا من الواجبات الشرعیه یتوقف علیه کما اشار الیه بقوله والمسلمون لا بد لهم من امام یقومُ بِتَنْفِیْذِ احکامهم واقامة حدود هم رسد ثغورهم وتجهیز جیوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتصلة وقطاع الطریق واقامة الجمع والاعیاد وقطع المنازعات الواقعات بین العباد وقبول الشهادات

القائمة علی الحقوق وتزویج الصغار والصغائر الذین لا اولیاء لهم وقسمة الغنائم. (۱۰۹)

ترجمہ: ''پھر اس بات پر اجماع ہے کہ امام کا مقرر کرنا واجب ہے اور اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ مخلوق پر واجب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی بناء پر کہ جو مر گیا اور اپنے زمانے کے امیر کو نہیں پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا اور اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت نے سب سے اہم کام امام کے تعین کو قرار دیا یہاں تک کہ دفن پر مقدم رکھا اور ایسا ہی ہر امام کی وفات کے بعد ہوا اور اس لیے بھی کہ بہت سے شرعی واجبات اس پر موقوف ہیں جیسا کہ ماتن نے اشارہ کیا کہ مسلمانوں کیلئے ایک ایسا امام ضروری ہے جو ان کے احکام کو جاری اور ان کے حدود کی اقامت اور ان کے سرحدوں کی حفاظت اور ان کے لشکروں کی تیاری اور باغیوں، چوروں، ڈاکوؤں کو مغلوب اور جمعہ وعیدین کی اقامت اور لوگوں کے درمیان پیدا شدہ قضیوں کا فیصلہ اور حقوق پر ثابت ہونے والی شہادتوں کو قبول اور لاوارث بچوں اور بچیوں کی شادی اور مال غنیمت کی تقسیم کرنے کی ذمہ داری اٹھائے''۔

علامہ ابن حزم لکھتے ہیں۔

اتفق جمیع اهل سنة وجمیع المرجبه وجمیع الشیعة وجمیع الخوارج علٰی وجوب الامامة وان الامة واجب علیها الانقیاد لامام عادل یقیم فهیم احکام اللّٰه ویسوسهم باحکام الشریعة التی اتی بها رسول اللّٰه صلی حاشا النجدات من الخوارج الملل والنحل (۷۳)

ترجمہ:۔ ''تمام اہل سنت، مرجیہ، شیعہ باستثناء نجدات تمام خوارج امامت کے وجوب پر متفق ہیں۔ اور اس بات پر بھی کہ امت پر ایک ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ کے احکام قائم کرے۔ اور لوگوں کا نظم اس شریعت کے احکام کے مطابق چلائے جو اللہ کے رسولؐ لائے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفائق میں لکھتے ہیں:

''واجب بالکفایہ امت بر مسلمین الیٰ یوم القیامتہ نصب الخلیفہ مستجمع شروط بچند وجہ یکے آنکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم بہ نصب خلیفہ وتعین وپیش از دفن آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ شدند پس اگر از شرع وجوب نصب خلیفہ ادراک نمی کردند بریں امر خطیر مقدم نمی ساختند وایں وجہ اثبات دلیل شرئی از آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماید بروجہ اجمال''۔

ایسے خلیفہ کو مقرر کرنا جو جامع شرائط ہو روز قیامت تک مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ چند وجوہ کی بناء پر پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام نے خلیفہ کے نصب اور تعین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین پر مقدم رکھا۔ اگر انہوں نے خلیفہ کے تعین کے وجوب کو شریعت سے ادراک نہ کیا ہوتا تو اس اہم کام پر اسے مقدم نہ کرتے یہ صورت اجمالی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دلیل شرعی کا اثبات کرتی ہے۔

ان معتبر حاملین شریعت نے امام اور خلیفہ کے تعین کو فرض کفایہ بتایا اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ اس بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ فریضہ کسی خاص وقت کیساتھ مخصوص یا کسی خاص مقام کیساتھ مقید نہیں ہے اس لئے مخصوص حالات یا مخصوص ممالک ومقامات اور موہوم خطرات کی بناء پر اس فرض کفایہ کی فرضیت اور اس کے ایک مسلم حقیقت ہونے سے انکار کرنا ایک جرم سے کم نہیں۔ ایک مومن کے لئے صحیح روش یہی ہوسکتی ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق اس کیلئے کوشش کرے اور اگر کوئی اپنے اندر ہمت اور سکت نہیں پاتا تو کم از کم جو بات ہوسکتی ہے وہ یہ کہ کوشش کرنے والوں کیلئے اللہ سے دعا کرے۔ رہے وہ لوگ جو اقتدار وقت کی خوشامد اور ذاتی فائدوں کیلئے اسلامی حکومت کا نام لینے والوں کے سروں پر کلہاڑی مارنے پر آمادہ ہیں۔ انہیں خدا سے ڈرنا چاہیے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے لادینی حکومتوں کے قیام کی تائید کرسکتے ہیں لیکن خلافت علیٰ منہاج النبوت قائم کرنے کیلئے تحریک اقامت دین کی تائید نہیں کرسکتے بلکہ اس کے مقابلہ کیلئے محاذ بناسکتے اور کوشش

کرنے والوں کو غیر مسلموں کے سامنے مطعون کر سکتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:۔

ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں حکومت مقصود نہیں ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت کو نصب العین نہیں بنایا جاسکتا لیکن ہم نہیں سمجھ سکے کہ کسی چیز کو قابل رد اور قابل اجتناب قرار دینے کیلئے مقصود اور نامقصود کی بحث کیوں چھیڑی گئی۔ کسی چیز پر حکم لگانے کیلئے فقہ میں جو اصطلاحیں ہیں انہیں کیوں نہیں استعمال کیا گیا نامقصود کے بجائے حرام، مکروہ، ناجائز کہنا زیادہ مناسب تھا یہ سیدھا طریقہ چھوڑنے کی وجہ یا تو لفظ غیر مقصود کی فقہی اصطلاح سے ناواقفیت ہے یا لوگوں کو فریب دینے کی کوشش، فقہ کی اصطلاح میں کسی شئے کے غیر مقصود ہونے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ چیز غیر اہم اور لائق اجتناب ہے۔ فقہاء نے عبادات کی دو قسمیں کی ہیں مقصودہ اور غیر مقصودہ۔ مثلاً نماز عبادت مقصود ہے اور وضو، سترِ عورت، استقبالِ قبلہ، اذان غیر مقصودہ ہیں لیکن اس کے باوجود وضو فرض ہے۔ ستر عورت، استقبال قبلہ، نماز کیلئے شرط ہیں اور اذان کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اگر کوئی بستی بالکلیہ اذان کو ترک کر دے تو اس سے قتال کیا جائے گا۔ اب ایک شخص کہے کہ یہ ساری چیزیں دین میں مقصود نہیں ہیں اس لئے نعوذ باللہ غیر اہم اور ناقابل اہتمام ہیں تو اس شخص پر آپ کیا حکم لگائیں گے۔

فقہاء نے امور دین کو پانچ اقسام پر تقسیم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، آداب حدود اور تعزیرات اس تقسیم کی بناء پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اصطلاح فقہ کی رو سے دین کا کم از کم ۳/۵ حصہ مقصود نہیں ہے۔ مثلاً قتال فی سبیل اللہ افضل ترین عبادت ہے لیکن اس کے باوجود خود مقصد نہیں ہے بلکہ ایک مقصد کا وسیلہ ہے۔ اسی طرح شریعت کے حدود ہاتھ کاٹنا، کوڑے لگانا، سنگسار کرنا بھی اصلاً خود مقصود نہیں ہیں، لیکن ان کی اہمیت و وجوب کا حال یہ ہے کہ ان کا انکار یا ترک تو دور کی بات ہے ان سے غفلت یا مجرمین کی پاسداری اور رعایت بھی

جرم عظیم ہے۔

لا تَأخُذُکُم بِھِمَا رَأفَةٌ فی دین اللّٰہِ اِنْ کُنتُم تُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالیَومِ الآخِرِ o

ان دونوں زانی مرد اور عورت پر تم کو اللہ کے دین میں رحم نہ آئے اگر تمہیں اللہ اور قیامت پر ایمان ہے۔

چنانچہ اس طرح کے سارے احکام فقہاء کی زبان میں مقصود الفعل اور مطلوب التحصیل لغیرہٖ ہیں یعنی جن کا کرنا مقصود ہے جن کی تحصیل کسی غیر شئے کیلئے مطلوب ہے۔

بعض عبادتیں خود مقصود بالذات ہوتی ہیں مثلاً نماز، روزہ اور بعض عبادتیں کسی دوسری عبادت کا ذریعہ اور شرط بنتی اور وسیلہ کا کام دیتی ہیں مثلاً وضو نماز کیلئے شرط ہے۔ محض اسی فرق کو ظاہر کرنے کیلئے مقصود اور غیر مقصود کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غیر مقصود احکام غیر اہم ہیں بلکہ تعمیل وادائیگی کے لحاظ سے عبادات مقصودہ پر مقدم ہیں۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کو غیر مقصود کہنے کی غرض یہ ہے کہ شریعت میں مومن کا مقصد وجود صرف رضائے الٰہی ہے۔ حکومت اصل مقصود نہیں۔ ہم کو تسلیم ہے اور کسی مومن کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ مومن کا مقصد وجود رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے ہم اقامت دین اور قیام خلافت کی جدوجہد کے مکلّف نہیں ہیں عبادات مقصودہ کا اصل مقصد بھی رضائے الٰہی کا حصول ہی ہے تو کیا نعوذ باللہ ہم ان کے مکلّف نہیں ہیں اور آزاد ہیں کہ جس طرح جی چاہے رضائے الٰہی حاصل کریں۔ اسلامی حکومت کی اصل غرض تو یہی ہے کہ تمام عبادات اور تمام احکام ٹھیک اسطرح ادا کیے جائیں جسطرح اللہ ورسول نے ہمیں سکھائے ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے مومن کا مقصد اصلی رضائے الٰہی ہے۔ **لاریب فیہ مگر جو اس کے ذرائع وشرائط ہیں انہیں اگر نا مقصود کہہ کر الگ کر دیا جائے تو شریعت**

کے ایک بہت بڑے اصول کا بطلان لازم آتا ہے وہ یہ کہ عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز نہیں۔ لیکن اس طریقہ استدلال سے یہ اصول ٹوٹ جاتا ہے۔ رضائے الٰہی کے حصول کیلئے اجتماعی احکام پر عمل کرنا یا عمل کرنے کی سعی کرنا بھی ضروری ہے۔

مثال کے طور پر شریعت کے حدود تعزیرات کی تنفیذ اور کتاب وسنت کے مطابق مقدمات مخاصمات کے فیصلے بھی ضروری ہیں اوران کی شرط ووسیلہ حکومت اسلامی کا قیام ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ حکومت اسلامی کی بات مت کرو کیونکہ یہ مقصود نہیں ہے تو ظاہر ہیکہ رضاے الٰہی کی تحصیل کا مکلّف بنانا تکلیف لا ایطاق کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت میں انسان کو کسی چیز کا مکلّف بنانے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے حصول کیلئے جو اسباب و ذرائع اور شروط ضروری ہیں ان کے حاصل کرنے کی وہ کوشش کرے اگر وہ کوشش کرتا ہے اور بالفرض منزل تک پہنچنے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو وہ کامیاب ہے گویا کوشش ہی اس کی منزل تھی لیکن اگر وہ کوشش بھی نہیں کرتا اور مر جاتا ہے تو پھر رضائے الٰہی کا انمول موتی کس طرح اسے مل سکتا ہے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے اب تک جو گفتگو ہوئی وہ بندے کے لحاظ سے تھی کہ بندہ کا مقصدِ حیات کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ شریعت وضع کرنے اور انبیاء ورسل کا سلسلہ قائم کرنے سے خداوندِ عالم کا کیا مقصد ہے وہ تو بے نیاز ہے اس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں وہ نہ بندوں سے کچھ چاہتا ہے اور نہ بندے اسے کچھ دے سکتے ہیں۔ اس لیے خالق کائنات کا مقصود صرف یہی ہوسکتا ہے کہ بندے بلاکسی تفریق واستثناء اسکے ہر حکم کی تعمیل کریں اور دنیا وآخرت میں اس کی رحمتوں کے مستحق بنیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِّزْقٍ وَّمَا اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ٥ (الزاریات. ۳۲)

ترجمہ:۔ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔
اس سلسلہ میں علامہ شاطبی نے جو کچھ لکھا ہے اسکا ماحصل یہ ہے کہ۔

شریعت وضع کرنے سے شارع کا مقصد یہ ہے کہ بندے کا قصد شارع کے قصد کے موافق ہو اور اس کا عمل شارع کی منشاء کے خلاف نہ ہو اسلیئے کہ شریعت بندوں کے مصالح کے مطابق اتاری گئی ہے اور اس لیے بھی کہ انسان اللہ کی عبادت کے واسطے پیدا کیا گیا ہے اور عبادات کا حاصل یہ ہے کہ شارع کی منشاء پوری کر کے دنیا و آخرت دونوں جہاں میں رحمت خداوندی کا استحقاق پیدا کیا جائے اور اس لئے بھی کہ شارع کا مقصد شریعت سے ضروریات، یعنی دین، عقل، نسل، نفس، مال کی حفاظت کرنی ہے اور شریعت کے ان مصالح کو بروے کار لانے میں انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور خلافت کی کم از کم حد یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر قائم کرے اور پھر دوسروں پر۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته"

تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ قرآن میں آیا ہے۔

آمنوا باللّٰه ورسوله وانفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه (حديد)

انی جاعل فی الارض خلیفة

لیستخلفنکم فی الارض فینظر کیف تعلمون ہ

اور اللہ واس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔
وہ زمین میں تم کو خلیفہ بنائے گا تا کہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

جعلکم خلائف فی الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجت لیبلوکم فی ماآتاکم۔

اس نے زمین میں تم لوگوں کو خلیفہ بنایا اور تمہارے بعض کو بعض پر فوقیت دی تا کہ تمہیں آزمائے دی ہوئی چیزوں میں۔

یہ خلافت عام ہے کہ ایک فرد کی انفرادی ذمہ داری سے لیکر ایک امیر، ایک خلیفہ وقت کی ذمہ داریوں تک کو شامل ہے۔ جیسا کہ حدیث میں تفسیر کر دی گئی ہے۔

الامیر راع والرجل راع علیٰ اھل بیتہ والامرأۃ راعیۃ علی بیت زوجھا وولدہ فکلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔

امیر نگراں ہے اور مرد نگراں ہے۔ اپنے گھر والوں پر اور عورت نگراں ہے اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد پر پس تم میں کا ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک سے پوچھ ہوگی اس کی رعیت کے متعلق، جب انسان خلیفہ ہے تو لامحالہ اس سے مطلوب اس کے علاوہ کیا ہوگا کہ حاکم اصلی کے احکام جاری کرے اور اس کے مقاصد پورے کرے۔ (موافقات جلد ۲۔ ۲۳۰)

علامہ شاطبی نے جو پہلو یہاں نمایاں کیا ہے اس کی رو سے احکام شرعیہ میں سے بعض کو مقصود اور بعض کو نا مقصود قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے۔ اگر بندے کا مطلوب رضائے الٰہی ہے تو اللہ کو اس کی اطاقت وعبادت اور خلافت مطلوب ہے اسی لیے مومن جب تک نیابت الٰہی کے فرض کو انجام نہیں دیتا اس کا مقصد وجود پورا نہیں ہوتا اور وہ منشائے الٰہی کی تعمیل سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

مسئلہ خلافت وامارت ہندوستان میں:۔

ہماری اوپر کی گفتگو بڑی حد تک منقح ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کے لیے کسی امیر یا امام کی اطاعت سے آزاد ہو کر زندگی گزارنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ اس لیے ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ختم ہونے کے بعد شرعی نظام قائم کرنے کے لیے انگریزی اقتدار سے کسی نہ کسی انداز میں علماء ٹکراتے رہے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل رحمہ اللہ علیہ،

مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا محمود الحسن وغیرہ کے حالات زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہمیں یہ حقیقت واقعہ سمجھ میں آسکتی ہے۔

۱۹۱۴ء سے مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کردیا جائے اور مولانا محمود الحسن کو امیر الہند بنادیا جائے لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔ مولانا آزاد کو جب اس طرف سے مایوسی ہوئی کہ پورے ملک کے لیے کوئی متفقہ متحدہ نظم قائم ہوتو پھر انھوں نے یہ اردہ کیا کہ اصلاً صوبے وار تنظیم کا کام شروع کردیا جائے۔ چنانچہ جب صوبہ بہار میں امیر شریعت کا انتخاب ہوا تو مولانا نے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرات علمائے بہار کو مبارک باددوں کہ انہوں نے سبقت بالخیرات کا مقام حاصل کیا۔ جمعیۃ العلمائے بہار کے جلسہ میں تین سو کے مجمع علماء نے بالاتفاق اپنا امیر شریعت منتخب کرلیا۔ (خطبات آزاد۔ص ۱۳۷)

اس طرح ہمارے ملک ہندوستان میں امیر الہند اور امیر شریعت کے انتخاب اور دار القضاء کے قیام وغیرہ کا تصور اور کوشش کا ایک تسلسل ہے جو ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ یقیناً جن ہستیوں نے جتنا بھی خون پسینہ اس راہ میں بہایا ہے اور بہار ہے ہیں وہ ان کے لیے عنداللہ بلندی درجات کا سبب ہوگا اور اس لحاظ سے خصوصاً امارت شرعیہ بہار ۱۹۲۱ء کی کارکردگی تمام مسلمانوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اے کاش ہندوستان کے بقیہ سارے علاقوں میں اسی طرح کوشش کی گئی ہوتی لیکن اسی کے ساتھ ہم کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیے کہ مسلمانوں پر نصب امام خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کا جو فریضہ شرعاً عائد ہوتا ہے وہ علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔ اور نظام کفر کے تحت امارت شرعیہ اور دار القضاء کے قیام سے وہ اصل فریضہ ادا نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کی ساری کوشش تیمّم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن پر اکتفاء اور قناعت کرنا صحیح نہیں ہوگا تیمّم ایک عارضی اور مجبوری کی چیز ہوتی ہے۔ لہٰذا اصل کے لیے کوشش کرنا لازمی فریضہ ہوگا۔

موجودہ حالات ہجر میں جو دارالقضاء بھی قائم کیا جائے گا اس کی کارکردگی کا دائرہ محدود اور نظام کفر کے تحت دی ہوئی گنجائشوں کے اندر ہوگا۔ مثلاً نکاح، طلاق اور تقسیم وراثت جیسے چند مسائل سے متعلق کوئی قاضی فیصلہ کرسکتا ہے۔ اور اس کو بھی ملک کی عدالتوں میں چیلنج کر کے بے اثر بنایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس دارالقضاء کو حکومت کی سند جواز حاصل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جن نصوص قرآنیہ اور دلائل شرعیہ کی بنا پر ہم دارالقضاء کے قیام کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ شادی بیاہ، طلاق اور تقسیم وراثت ہی نہیں بلکہ زندگی کے جملہ معاملات اور نزاعات کا فیصلہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق ہو ورنہ ہم ان آیات کے مصداق قرار پائیں گے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون ٥ (سورہ المائدہ. ٤٤)

اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ.

ترجمہ:۔ اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اس ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے۔ اور پھر چاہتے کہ اپنے معاملہ کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں۔ حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت کا کفر کریں۔ کسی غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے تحت جو دارالقضاء بھی قائم ہوسکتا ہے اس سے وہ مقصد ہرگز پورا نہیں ہوسکتا جو دین میں مطلوب ہے اور جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے۔ البتہ بہ حالت مجبوری عبوری دور کے لیے وہ کرنے کا ایک کام ہے جو کرنا چاہیے۔ شائد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بوجہ ہماری مجبوری اور عدم استطاعت بھی مقبول ہوجائے لیکن اس کے ساتھ ہمیں خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کی تمنا اور حتی الوسیع کوشش سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن عام طور پر دیکھا جارہا ہے کہ جو لوگ اس عبوری دور کے فریضہ کی دائیگی کی

طرف متوجہ ہیں اسی پر قانع ہوکر رہ گئے ہیں۔اوراس کے آگے نہ سوچتے ہیں اور نہ عملاً کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں جو انتہائی افسوناک واقعہ ہے۔اس کے لیے عوام تو خدا کے پاس باز پرس سے شائد بچ جائیں لیکن خواص اور علماء جن کی نگاء میں قرآن، حدیث وفقہ کے اصول وفروع تمام موجود ہیں وہ کس طرح بچیں گے۔

اس طرح جو لوگ خلافت اسلامیہ اور نظام اسلامی کے قیام کی بات کرتے ہیں وہ عبوری دور کے اس فریضہ کی اہمیت کو بڑی حد تک محسوس نہیں کرتے ان سے اللہ کے حضور پوچھ ہوسکتی ہے کہ تم نظام کفر وشرک کو ہٹا کر نظام شرع اگر قائم نہیں کرسکتے تھے تو محدود پیمانے پر ہی سہی تم نے اپنی استطاعت کی حد تک حکم بماانزل اللہ کرنے کا نظام کیوں نہیں قائم کیا۔

بہرحال دونوں کام کرنے کے ہیں ہر کام کا دین میں ایک اہمیت اور مقام ہے۔جس کو ہمیں سمجھنا چاہیے۔مولانا آزاد کی ایک تحریر سے اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

حضرات :۔

اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کردوں، جس کو میں علیٰ وجہ البصیرت آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لیے بمنزلہ اصل واساس کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ سال کے مسلسل غور وفکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدہ کار حل نہیں ہوسکتا۔میرا اشارہ مسلۂ نظام وجماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلہ نظام جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پزیر نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنی موجودہ حیات انفرادی کو ترک کرکے حیات اجتماعی وشرعی اختیار نہ کرلیں۔یعنی احکام نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر وقائد شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہوجائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہوجائے۔یہی اصل اساس کار ہے اور تمام مقاصد اصلاح اور

مصالح انقلاب کا نفاذ وظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔

حضرات

اسلام کے نظام اجتماعی کی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل و توفیق الٰہی سے اس وقت میرے گردو پیش موجود ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کے تمام حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں فرادی، متفرق الگ الگ اور منشتت نہ ہوں۔ ہمیشہ مجتمع۔ موتلف متحدہ اور نفس واحدہ ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں جا بجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا اور کفر و شرک کے بعد کسی بد عملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جیسا کہ تفرقہ و تشتت سے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و اعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بمنزلہ محور و مرکز کے قرار پائی اور تمام دائرہ عمل اسی کے گرد قائم کئے گئے عقیدہ توحید سے لے کر تمام عبادات و اعمال تک یہ حقیقت مرکز یہ جلوہ طرازی کر رہی ہے۔ اور اسی بناء پر بار بار نظام جماعت پر زور دیا گیا۔

علیکم بالحماعه و السمع و الطاعه (رواہ ترمذی)

اور علیکم بالحماعه فان الشیطان مع الفذو هو من الا ثنین بعد۴۳ (رواہ البیہقی)

اور اذ کان ثلا ثة فی سفر فلیوم و احد کم۱۴۴ (رواہ اصحاب السنین)

اور اسی لیے نظم و قوام ملت کی منصب خلافت کی اطاعت قرار دیا گیا کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہو جائیں۔ شرح اس مقام کی بہت طولانی ہے اور معارف کتاب وسنت اس بارے میں بے شمار اور حد احصاء و استقصاء سے باہر ہیں۔ رسالہ خلافت پر میں بحث کر چکا ہوں، اور زیادہ شرح و تفصیل تفسیر قرآن میں ملے گی۔

میں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا، کیونکہ گزشتہ آخری صدیوں میں مسلمانوں کا شیرازہ اجتماع پراگندہ ہوا اور تقریباً پانچویں صدی ہجری کے بعد سے اس پراگندگی

کے اسباب یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ایں ہمہ تفریق و پراگندگی ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی اور جب تک وہ قاتم رہی نظام جماعت بھی قائم رہا۔لیکن اسلامی حکومت کے انقراض کے بعد مسلمانان ہند کا نظم جماعت درہم برہم ہوگیا اور سرتا سر جاہلیت کی سی بے نظمی و بے قیدی ہم پر چھاگئی۔ بلاشبہ مرکزی خلافت آل عثمان کی موجودتھی اور مسلمانان ہند کے لیے بھی تمام مسلمانان عالم کی طرح وہی خلیفہ ومطاع تھے لیکن مسلمانانِ ہند کا فرض تھا کہ یا تو اپنے علائق فعلاً وعملاً پایگاہ خلافت سے قائم کرتے اوراس کے ایک موجود و عامل نائب کی نیابت حاصل کر کے اپنے فرض اسلامی انجام دیتے اور اگر ایسا ہونا دشوار تھا اور واقعی بات یہ ہے کہ دشوار تھا اعادہ حال اور ہتیہ کار اور ادائے فرض اسلامی میں کوشاں ہوتے۔لیکن بدبختانہ ایسا نہیں ہوا اور جہاں غیر مسلم غلبہ واستیلاء پر محکومانہ قناعت کرلی گئی وہیں اس اولین فریضہ ملت کی طرف سے بھی ہمتوں کے قصور اور عزائم کے فقدان نے کوتاہی کی۔ بہرحال ایک زمانہ دراز اس پر گزر گیا اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرہ ارض میں سب سے بڑی اسلامی جماعت ہے جو ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کررہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتہ انسلاک ہے نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ۔ نہ تو کوئی قائد وامیر ہے اور نہ کوئی آمرونافذ شرع۔محض ایک بھیڑ ہے ایک انبوہ ہے، ایک گلہ ہے، جو ہندستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے۔اور یقیناً ایک حیات غیر شرعی و جاہلی ہے جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہوگئی ہے۔

اس حالت کے مفاسد وشرور میں ایک بہت بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ برسوں سے ہندوستان میں شریعت کا باب قضاء گویا بالکل معدوم ہوگیا ہے۔ کیونکہ قضاء کا وجود بلا قاضی کے نہیں ہوسکتا اور قاضی کا وجود امارت وامامت کے قیام پر موقوف ہے۔

حضرات

ایک منصب قضاء ہے ایک منصب امارت ہے دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ قضاء امارت کے مقاصد میں داخل اور اس کے ماتحت ہے، مگر مقاصد امارت قضاء سے حاصل نہیں ہو سکتے، پس یہ مقاصد امارت کے فقدان کا ذکر کر رہا ہوں، صرف قضاء کا ذکر نہیں کرتا جس کے لیے محض نام نہاد قاضیوں کا تقرر یا فرضی عدالتوں کا اجراء کافی ہو۔

حضرات

اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالت میں ہم کوئی قدم مقاصد اعمال ملیہ کا اٹھا سکتے ہیں؟ کیا احیائے تجدید ملت اور قیام شرع و ادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی صحیح راہ پیدا ہو سکتی ہے؟ کیا محض ایک بھیڑ اور انبوہ لے کر ہم وہ فرائض انجام دے سکتے ہیں؟ جن کے لیے اولین شرط عقلاً و شرعاً وجود جماعت منظمہ اور امارت صحیح شرعیہ ہے۔ چھوڑ دیجئے۔ مصطلحات شرعیہ کو اگر ان سے ہمیں اس قدر بعد ہو گیا ہے کہ ساری باتوں کے لیے تیار ہیں مگر بحکم اشمازت قلوب الذین لایؤمنون بالاخرہ طریق شرعی اور اس کے نظام وقوام کے الفاظ سن کر یکا یک متوحش ومضطرب الحال ہو جاتے ہیں تو صرف انہی قواعد و اصولوں کو سامنے لائیں جن پر آج تمام اقوام عالم عامل ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر ایک قائد اور لیڈر کے کوئی جماعت اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر وہی حقیقت تو شریعت نے بھی لفظ امیر یا امام میں مضمر رکھی ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ اگر لیڈر کا لفظ کہا جاتا ہے تو آپ اس کا استقبال کریں اور امیر و امام کا لفظ آ جائے تو نفرت واستکراہ سے بھر جائیں۔ کیا یہ وہی غلطی نہیں جس کو راہ تاسیس اور راہ تجدید کی اصطلاح میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں۔

اس کو بھی چھوڑ یئے۔ آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور ادائے فرض شرعی کی سب سے بڑی نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے جو آزادی ہند اور مسئلہ خلافت کی شکل میں ہمارے

سامنے آگئی ہے۔آج ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں جو اس وقت تک سرشار غفلت تھے۔ اوراب آمادہ ہوئے ہیں کہ اطاعت واعانت خلیفہ عہد، حفاظت وصیانت بلاد اسلامیہ اور آزادی ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرض اسلام انجام دیں۔ خدارا بتلایئے اس صورت حال میں بھی طریقہ کار کیا ہونا چاہئے، اور ایسے وقتوں کے لیے آخر اسلام نے بھی کوئی نظام کار بتلایا ہے یا نہیں یا وہ باوجود دعویٰ تکمیل شرع اس قدر نامراد ہوگیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل نہیں۔ اگر بتلایا ہے تو وہ کیا ہے یا محض انجمن سازی اور ہنگامہ مجالس آرائی کیا محض اتباع ارائے رجال اور تقلید ارباب فن وتخمین؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہ شرعی صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہوسکتی۔

جو فتنہ آج یورپ سے اٹھا ہے چھٹی صدی ہجری میں بھی اس کے سیلاب بلاد تا تار وچین سے اٹھے تھے اور تا تاریوں کے استیلا سے تمام عالم اسلامی تہ وبالا ہوگیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلاد شرقیہ اسلامیہ کا یہی حال تھا جو آج نظر آرہا ہے۔ لیکن اس عہد کے علماء نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تا تاریوں کا قبضہ واستیلا ہوگیا تھا وہاں تنظیم جماعت اور قیام شرع کے لیے ولاۃ مسلمین کے نصب وتقرر کا حکم دیا اسی بناء پر فقہا نے متاخرین کے یہاں اس کی تصریح پاتے ہو کر بلاد محکمہ کفار میں طلب والی مسلم امارت واجب ہے۔ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہ نے انہیں بلاد محکمہ تا تار کے لیے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابداًاس تغیر پر قانع نہیں ہونا چاہیے اور ایک لمحہ بھی بغیر کسی امیر کے بسر نہیں کرنا چاہیے۔ یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اور یا ایک امیر نصب کرکے اپنے فرائض شرعیہ انجام دیں۔

فی الحقیقت احکام شرعیہ کی رو سے مسلمانان ہند کے لیے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں یا تو ہجرت کر جائیں یا نظام جماعت قائم کرکے ادائے فرض ملت میں کوشاں ہوں۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے جن دو راہوں کی نشاندہی فرمائی ہے وہ کتاب

وسنت، تاریخ انبیاء، اور سیرت خاتم النبین اور دینی مسلمات کی روشنی میں فرمائی ہے۔ درحقیقت تیسری راہ یعنی اہل کفر وشرک کے مستقلا اور بلا کراہیت ماتحت اور زیر نگیں ہو کر رہنے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ استثنائی اور عارضی صورت حال کی بات الگ ہے کہ اس وقت ارتکاب حرام کی بھی اجازت نکل آتی ہے لیکن اس مقام پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ ہجرت کا مرحلہ دوسرے نمبر پر ہے۔ دینی اور شرعی زندگی گزارنے اور اشاعت دین اور غلبہ حق کے لیے راہیں جب بالکل بند ہو جائیں تو ہجرت کا سوال پیدا ہوتا ہے اس کوشش کے بغیر ہجرت کرنا فرار اور اپنی ذمہ داریوں سے گریز کے معنی ہوگی جو نا قابل معافی جرم ہے۔